Version No.			

ROLL NUMBER						

Answer Sheet No.____________

Sign. of Candidate ____________

Sign. of Invigilator ____________

اردو (لازمی) برائے بارہویں جماعت

ماڈل سوالیہ پرچہ (کریکلم 2006ء)

حصہ اوّل (کل نمبر :20، وقت: 25 منٹ)

حصہ اول لازمی ہے۔ اس کے جوابات اسی صفحہ پر دے کر ناظم مرکز کے حوالے کریں۔ کاٹ کر دوبارہ لکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ لیڈ پنسل کا استعمال ممنوع ہے۔

سوال نمبر 1: ہر جزو کے سامنے دیے گئے درست دائرہ کو پر کریں۔

(1) پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے　　جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

اس شعر میں کون سی صنعت استعمال ہوئی ہے؟

(A) تعلیل ○　　(B) تلمیح ○

(C) تضمین ○　　(D) تکرار ●

(2) ماموں بھانجا لڑ پڑے۔ اس جملے میں 'پڑے' کون سا فعل ہے؟

(A) اصل فعل ○　　(B) فعل مستقبل ○

(C) معاون فعل ●　　(D) فعل حال ○

(3) اسے کالے نے کاٹا۔ قواعد کی رو سے یہ کس کی مثال ہے؟

(A) کنایہ ●　　(B) مجاز مرسل ○

(C) تشبیہ ○　　(D) استعارا ○

(4) "اس کا مال، اسباب، زمین، جائیداد سب کچھ ____________" درج ذیل میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

(A) بک گئے ○　　(B) بک گئیں ○

(C) بک گئی ○　　(D) بک گیا ●

(5) وہ اشارے یا علامتیں جو کسی عبارت کے ایک جملے یا حصے کو دوسرے جملے یا حصے سے الگ کرنے کے لیے استعمال ہوں، کیا کہلاتی ہیں؟

(A) صنائع بدائع ○　　(B) مجاز مرسل ○

(C) رموز اوقاف ●　　(D) امدادی افعال ○

Scanned with CamScanner

(6) نظم و نثر میں کسی روایت یا تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کرنے کو کیا کہتے ہیں؟

(A) تشبیہ ○ (B) افسانہ ○
(C) رپورتاژ ○ (D) تلمیح ●

(7) اگر غزل کا دوسرا شعر بھی مطلع ہو تو اسے کیا کہتے ہیں؟

(A) مطلع ○ (B) مطلع ثالث ○
(C) مطلع ثانی ● (D) مقطع ○

(8) کسی امر کی تفصیل پیش کرتے وقت کون سی علامت لگاتے ہیں؟

(A) رابطہ ○ (B) ختمہ ○
(C) سکتہ ○ (D) تفصیلیہ ●

(9) کسی پیشے یا طبقے کے لوگ تبادلہ خیال کے لیے الفاظ کو وضعی معنوں کی بجائے مخصوص معانی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ایسے الفاظ کو کیا کہتے ہیں؟

(A) ذو معنی الفاظ ○ (B) سلینگ ●
(C) ہم آواز الفاظ ○ (D) تلمیح ○

(10) فقیرانہ آئے صدا کر چلے   میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
اس شعر میں صدا اور دعا کو کیا کہیں گے؟

(A) ردیف ○ (B) قافیہ ●
(C) تشبیہ ○ (D) استعارہ ○

(11) ماں نے کہا: چاند سو رہا ہے۔ قواعد کی رو سے یہ کس کی مثال ہے؟

(A) تشبیہ ○ (B) استعارہ ●
(C) کنایہ ○ (D) مجاز مرسل ○

(12) ایسی نظم جس میں ردیف، قافیے، وزن، بحر کا استعمال پابندی سے کیا جائے، کیا کہلاتی ہے؟

(A) نظم معریٰ ○ (B) آزاد نظم ○
(C) سانیٹ ○ (D) پابند نظم ●

(13) تنقید کس لفظ سے مشتق ہے؟

(A) نقد ● (B) نقاد ○
(C) ناقد ○ (D) ناقدین ○

(14) یہ کام آئیں نہ آئیں ہم انھی سے کام لیتے ہیں   "نگاہوں سے نقاب بنتے ہیں جو دامن تھام لیتے ہیں"
یہ شعر کس صنعت کی مثال ہے؟

(A) صنعتِ تفریق ○ (B) صنعتِ تضاد ○
(C) صنعتِ ایہام ○ (D) صنعتِ تقسیم ●

(15) درست جملے کی نشاندہی کریں۔

(A) اسلم نے "پتنگ" خریدا ○ (B) اسلم نے "پتنگ" خریدے ○
(C) اسلم نے "پتنگ" خریدی ● (D) اسلم نے "پتنگ" خریدیں ○

Scanned with CamScanner

(16) ذیل میں سے استدراکی جملہ کون سا ہے؟

(A) اتنا نوجوان اور اس قدر نیک
(B) مجھے اس کا یقین ہے کیوں کہ وہ میرا بھائی ہے
(C) چوں کہ بارش ہے اس لیے وہ نہیں آسکتا۔
(D) سب جانتے ہیں کہ وہ سچا ہے۔

(17) جب دو یا دو سے زیادہ الفاظ حقیقی معنوں کے بجائے مجازی معنوں میں استعمال ہوں تو کیا کہلاتا ہے؟

(A) روزمرہ (B) کنایہ
(C) محاورہ (D) مجاز مرسل

(18) جو فوراً سمجھ نہ آئے اور اس تک پہنچنے کے لیے سوچ بچار سے کام لیا جائے، کہلاتا ہے؟

(A) کنایہ قریب (B) کنایہ بعید
(C) مجاز مرسل (D) تشبیہ

(19) "پیکوں پر ستارے جھلملاتا" میں ستارے کیا ہیں؟

(A) تشبیہ (B) مجاز مرسل
(C) کنایہ (D) استعارہ

(20) علی بازار سے سبزی لایا۔ اس مثال میں متعلق فعل کون سا ہے؟

(A) علی (B) بازار سے
(C) سبزی (D) لایا

Scanned with CamScanner

اُردو لازمی ماڈل سوالیہ پرچہ برائے بارہویں جماعت اور حل

(حصّہ دوم)

سوالنمبر ۲:(الف) حصّہ نثر

سوالات کے جوابات۔

i- مصنف نے مولوی وحید الدین کو ایک نگینہ کیوں کہا؟

جواب:- مصنف نے مولوی وحید الدین کو ایک نگینہ اس لیے کہا کہ وہ نگینے کی طرح برسوں ناتراشیدہ رہے جب اس نگینے کو تراشا گیا چمک بڑھی اہل نظر میں قدر ہوئی اس وقت جھٹ سے ٹوٹ گیا۔ جس طرح نگینہ نایاب ہوتا ہے اسی طرح مولوی صاحب بھی اپنی عملی حیثیت میں بہت قیمتی تھے۔ مولوی صاحب میں ظرافت کا مادہ بہت زیادہ تھا۔

ii- شہرت بھی غالب کے قصیدے کی طرح آج کل کسی کو راس نہیں آتی۔ اس جملے کی وضاحت کریں؟

جواب:- غالب اچھی غزل گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین قصیدہ گو شاعر بھی تھے۔ غالب نے بادشاہِ وقت کا شہرہ آفاق قصیدہ لکھا لیکن اتفاق کی بات ہے کہ مرزا غالب نے جس پر بھی قصیدہ لکھا وہ کسی نہ کسی مصیبت کا شکار ضرور ہو جیسے بہادر شاہ ظفر کی حکومت ختم ہو گئی۔ اس لیے مصنف لکھتا ہے کہ جس شخص کو شہرت ملتی ہے اس کی زندگی مختصر ہو جاتی ہے۔ ویسے بھی قانون قدرت ہے کہ ہر عروج کو زوال پذیر ہونا ہے۔

iii- مصنف کے مطابق آج کل کا مرنا عجیب سا کیوں ہو گیا ہے؟

جواب:- پہلے لوگ زندگی کو چراغ سے تشبیہ دیتے تھے جس کے بجھنے میں کچھ وقت لگتا تھا۔ آج کل چراغ کی جگہ بجلی کے لیمپ نے لے لی ہے۔ اِدھر بٹن دبایا اُدھر اندھیرا۔ اسی طرح آج کل اموات بھی اچانک ہو رہی ہیں۔ یعنی پہلے انسان آہستہ آہستہ مرتا تھا لیکن آج کل لوگ جلد جلد مرنے لگے ہیں۔

iv- مصنف نے یہ کیوں کہا کہ چل چلاؤ کا زور ہے؟

جواب:- مصنف نے یہ فقرہ "چل چلاؤ کا زور ہے" اس لیے کہا ہے کہ دنیا ایک مسافر خانہ ہی ہے آج ایک کی باری تو کل دوسرے کی ۔مصنف کی آنکھوں کے سامنے اوپر تلے چند بڑی شخصیات اس دنیا سے رخصت ہو گئی تھیں۔ مولوی نذیر احمد گئے، شبلی نعمانی گئے اور اپنی باری پر مولوی وحید الدین بھی چلے گئے ہیں تو ہر "ذی روح کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے"

v- مصنف نے زندگی کو بجلی کے لیمپ سے تشبیہ کیوں دی ہے؟

جواب:- مصنف نے زندگی کو بجلی کے لیمپ سے اس لیے تشبیہ دی ہے کہ پہلے تو بیماری کی تشخیص نہیں ہوتی تھی انسان بیمار ہوتا تھا اور اسی بیماری میں آہستہ آہستہ ہی چل پڑتا تھا لیکن اب بیماری کی تشخیص بھی ہونے لگی اور جو چراغ کے ساتھ تشبیہ دی جاتی تھی لیمپ سے دی جانے لگی کہ ادھر بیمار ہوا اُدھر چل بسا جتنی تیزی انسان کی روزمرہ زندگی میں آئی اتنی ہی اس دنیا سے چلے جانے میں آگئی۔

vi- اردو کی محفل میں دو چار لیمپ جل رہے ہیں۔ مصنف کی کیا مراد ہے؟

جواب:- مصنف نے ان مصنفین اور شعرا کا ذکر کیا ہے جو آگے پیچھے چلے گئے ہیں۔ اور باقی رہ جانے والوں کو لیمپ سے ہی تشبیہ دی ہے۔ کیا کہ وہ روشن چراغ گل ہو گئے ہیں تو اب دو چار لیمپ اور موجود ہیں۔ جو اپنی لو سے دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے لیے زندہ ہیں۔ یعنی اردو زبان و ادب کی دنیا میں چند ہی نامور ہستیاں رہ گئی ہیں۔

vii- اس پیراگراف کی تلخیص کریں؟

جواب: تلخیص

مصنف نے مولوی وحید الدین کو نگینہ سے تشبیہ دی ہے اور یہ کہ شہرت بھی غالب کے قصیدے کی طرح ہے زیادہ دیر نہیں رہتی۔ زندگی بھی عارضی ہے آج ایک کی باری کل دوسرے کی۔ بلکہ زندگی تو اب چراغ کی بجائے بجلی کے لیمپ کی طرح ہو گئی ہے کہ اچانک ہی ختم ہو جاتی ہے۔

(ب) حصّہ نظم

سوالات کے جوابات

i- آج کا مسلمان ماضی کی نسبت خوار کیوں ہے؟

جواب:- آج کا مسلمان ماضی کے مسلمان کی نسبت خوار اس لیے ہے کہ وہ تن آسان ہو گیا ہے مسلمانوں کے اصل طرز زندگی سے ہٹ گیا ہے اور اپنے بزرگوں سے جو روحانی نسبت تھی اس کو بھی کسی حد تک فراموش کر چکا ہے۔ اپنے بزرگوں کی عزت، عظمت و شوکت کی مثالیں دے کر ہی وہ عزت دار نہیں ہو سکتا اصل میں آج کے مسلمانوں نے قرآنی تعلیمات کو ترک کر دیا ہے اس لیے خوار ہو گیا ہے۔

ii- درج بالا بند میں شاعر کیا پیغام دینا چاہتا ہے۔

جواب:- اس بند میں شاعر مسلمانوں کی توجہ اپنے طرز زندگی کی طرف دلا رہا ہے۔ ہر کوئی اپنی اپنی آسانی کی خاطر مسلمانوں کے اصل طرز زندگی سے دور ہو چکا ہے اور اب تم میں نہ تو حیدریؓ فقر ہے اور نہ حضرت عثمانؓ جیسی دولت ہے۔ تمہارے آباء اجداد اپنے وقت میں قابل عزت و وقار تھے لیکن تم قرآن کی تعلیمات کو چھوڑ کر آج زمانے میں اپنی عزت قائم نہ رکھ سکے۔

iii- حیدریؓ فقر اور دولت عثمانیؓ سے کیا مراد ہے؟

جواب آج کے مسلمانوں میں اپنے آباؤاجداد کے اوصاف باقی نہیں رہے اُن حضرت علیؓ جیسی قناعت پسندی اور درویشی رہی نہ ہی حضرت عثمانؓ جیسی دولت و ثروت کہ جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ ہوتی تھی۔ مسلمانوں میں ان دو عظیم ہستیوں جیسے اوصاف بھی نہیں رہے۔

iv- آج کے مسلمان کو اسلاف سے نسبت روحانی کیوں نہیں ہے؟

جواب:- شاعر کہتا ہے کہ آج کے مسلمان کو اسلاف سے نسبت روحانی اس لیے نہیں ہے کہ وہ اپنے آباؤاجداد کے طرز زندگی سے ہٹ گئے ہیں وہ قرآنی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارتے تھے لیکن آج کا مسلمان سب بھولا ہوا ہے لیکن توقعات ایسی ہیں کہ اللہ ان پر بھی اسی طرح مہربان ہو جائے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ کردار کے لحاظ سے تم ان سے بالکل مختلف ہو اس لیے ان کی روحانی زندگی سے تمہیں کوئی نسبت نہیں ہے۔

یا

سوالات کے جوابات

i- ٹیپ کا مصرع کیا ہوتا ہے؟ مثال دے کر واضح کریں۔

جواب:- کسی بھی ترجیع بند نظم کے بند میں بار بار آنے والے مصرعے کو ٹیپ کا مصرع کہتے ہیں۔ مثلاً

"او دیس سے آنے والے بتا"

ii- صنعت تکرار کی مثال دے کر واضح کریں۔

جواب:- کلام میں ایسے الفاظ لانا جن کی تکرار سے کلام میں زور اور حُسن پیدا ہو جائے۔

مثلاً

کیا شام کو اب بھی جاتے ہیں احباب کنار دریا پر

کیا شام کو اب بھی جاتے ہیں احباب کنار دریا پر

iii- شاعر اپنے دیس کے کن مناظر کو یاد کرتا ہے۔

جواب:- شاعر ان مناظر کو یاد کرتا ہے کہ شام کو دوست احباب اب بھی دریا کے کنارے پر جاتے ہونگے اور گھنے درخت دریا کے کنارے پر سرسبز ہوں گے۔ چاند بھی دریا کے کنارے پر آکر جھانکتا ہو گا اور یہ کہ کیا کسی کے سینے میں ہماری چاہت ہے اور دوستوں میں ہمیں اب بھی کوئی یاد کرتا ہو گا یا نہیں۔

iv- شاعر اپنے احباب کے حوالے سے کس خواہش کا اظہار کرتا ہے؟

جواب:- شاعر اپنے دوست احباب کی محبت کو یاد کرتا ہے۔ اور سوچتا ہے کہ پتہ نہیں اب بھی کوئی ہمیں یاد کرتا ہے کہ نہیں اور کسی کے سینے میں آج بھی وہ چاہت ہے کہ نہیں۔

ج (حصّہ غزل)

سوالات کے جوابات

i- شاعر کو فلسفی اور ملا سے غرض کیوں نہیں ہے؟

جواب:- شاعر کو فلسفی اور ملا سے غرض نہیں ہے کیونکہ شاعر ایک فلسفی کو دل کی موت جبکہ ملاء کو اندیشہ ء نظر کا فساد قرار دیتے ہیں۔

عشق کی بازی میں ہار اور جیت کا مرتبہ ایک جیسا کیوں ہے؟

جواب:- عشق کی بازی میں ہار اور جیت کا مرتبہ ایک جیسا اس لیے ہے کہ عشق میں جیت کی خوشی میں جیت ہو گی لیکن ہارنے میں بھی یہ خوشی ہو گی کہ وہ ہار کر بھی اپنے محبوب کو پالے گا۔ عاشق کا معشوق کے لیے محبت کے جذبے میں سرشار ہو کر ہار جیت کو برابر سمجھنا معمولی بات ہے۔

(iii)- ظفر اقبال کے درج شدہ تیسرے شعر کا مرکزی خیال لکھیے؟

جواب:- قناعت پسندی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو میسر ہوا وہ میری خواہش سے زیادہ ملا اور جو نہیں ملا اس پر کوئی افسوس یا حیرت نہیں کہ جتنا اس ذات نے عطا کیا ہے اصل میں اس کا بھی حقدار نہیں ہوں۔

د: <u>حصّہ قواعد</u>

i- درج ذیل جملوں میں سے امدادی فعل تلاش کر کے لکھیں؟

جواب:-

جملے	امدادی فعل
بازار سے سبزی لے آؤ	آؤ (آنا)
میں کتاب پڑھ سکتا ہوں	سکتا (سکنا)
بچے نے کھلونا توڑ دیا	دیا (دینا)

ii- مندرجہ ذیل اشعار میں استعمال ہونے والی صنعتیں تلاش کریں۔

جواب:- بنا ہے ---------نکتہ داں کے لیے = صنعت تضمین

ساماں سے --------موسیٰ عمران نہیں ہوتا = صنعت تلمیح

تیر ادر ----------بکھر جاؤں گا = صنعت تجنیس

iii- مندرجہ ذیل شعر میں قافیہ اور ردیف کی نشاندہی کریں۔

جواب:- سفر منزل شب یاد نہیں

لوگ رخصت ہوئے کب یاد نہیں

قافیہ: شب، کب

ردیف: یاد نہیں،

حصّہ سوم

سوال نمبر 3:- کسی ایک پیراگراف کی تشریح کریں؟

الف:- **ہم نے اپنی ہمت اور اولوالعزمی ----------غنچہ دہنی سے جاگ رہے ہیں**

تشریح:-

اس عبارت میں مصنف صبح اٹھنے یعنی جلدی اٹھنے کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کرتے ہیں کہ صبح اٹھنا بہت مشکل لگتا تھا لیکن آج احساس ہوا کہ صبح جلدی اٹھنا اتنا بھی مشکل نہیں ہے جتنا ہم نے سمجھ رکھا تھا بلکہ ہم تو اس بات سے ڈرا کرتے تھے کہ صبح کیسے اٹھا جا سکتا ہے یہ تو ناممکن سی بات ہے لیکن دیکھیے آج ہم نے اپنی ہمت مصمم ارادے سے یہ معرکہ بھی سر کر لیا ہے کہ آج واقعی ہمیں اپنے آپ پر اور اپنی اس ہمت پر فخر ہو رہا

ہے کہ آج ہم فوراً جاگ اٹھے ہیں ہم نے دل ہی دل میں کہا کہ یہ کوئی اتنی بھی مشکل بات نہیں ہے ایسے بھی ہم پر خوف طاری تھا۔ اتنے میں دل کی طرف سے بھی جواب آیا کہ ہاں تم تو ایسے ہی گھبرا جاتے تھے کیونکہ

"ہمت کرے انسان تو کیا نہیں ہو سکتا"

اور پھر مصنف اپنے دل سے بات کرتے ہوئے وضاحت کرتے ہیں کہ اگر ہم سستی اور کاہلی کو اپنے قریب نہ آنے دیں اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دیں تو ان کی کیا جرات وہمت کہ وہ ہمارے روزمرہ کے معمولات اور باقاعدہ کرنے والے کاموں میں دخل دیں۔

صبح خیزی کے کیا فائدے ہیں اور کیا راحت اور فرحت ہے یہ تو آج صبح ہم بیدار ہوئے تو اندازہ ہوا ہے کہ وہ جو بچپن میں سنتے تھے کہ "صبح جلدی اٹھنے والے کے پاس دن بھر بہت وقت ہوتا ہے کہ وہ اپنے کام نبٹائے"

بالکل صحیح لگ رہا ہے اور آج اپنے اشرف المخلوقات ہونے کا یقین ہی ہو چلا ہے فخر ہی ہو رہا ہے کیونکہ اس وقت اس لاہور شہر میں ہزاروں کاہل اور سُست لوگ ہوں گے جو دنیا اور اس میں موجود ہر چیز سے بے خبر خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہوں گے۔ ان کو اس روحانی خوشی کا اندازہ ہی نہیں جو آج ہم محسوس کر رہے ہیں۔ مصنف کی بات تو خیر اہم ہے ہی ہمارے ہی ایک استاد محترم تھے جو کہتے تھے کہ جو سوتا وہ کھوتا ہے اور اس کا مفہوم بڑے ہی عمدہ اور واضح انداز میں سمجھا دیئے گئے ہیں کہ انسان اگر غفلت کی نیند سو رہا ہے تو کتنا نقصان اٹھاتا ہے۔ ہاں تو بات ہو رہی تھی لاہور میں سونے والوں کی وہ تو مزے سے سو رہے ہوں گے لیکن ایک ہم ہیں کہ اپنے فرض کو بخوبی ادا کرنے کی خاطر بڑی ہی کھلی ہوئی طبیعت سے مسکراتے چہرے کے ساتھ جاگ رہے ہیں۔

سوال نمبر2 :- (ب)

جب اپنے ملی مفاد---------- بھی ادا کر پائیں گے

تشریح:-

مصنف کہتے ہیں کہ ہمارا تصور ملت بہت حقیقی اور واضح ہے قیام پاکستان سے پہلے مسلمانان ہند میں بھی یہی جذبہ موجود تھا وہ وحدت ملت کے قائل تھے لیکن ہر فکر و شعور نے وطنیت کو یکسر نکال دیا اور حقیقی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ہمیں ایک ایسے خطے کی ضرورت محسوس ہوئی جہاں ہم اسلامی اصولوں کے مطابق آزادانہ زندگی گزار سکیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے اپنے ملی مقاصد کے فروغ کے لیے ہم نے ایک الگ وطن حاصل کر لیا۔

اب ہم پر لازم ہے کہ یہ ہمارے لیے کافی ہے یا ناکافی ہے ہم اس کی حفاظت کے لیے اپنا تن من دھن قربان کر دیں۔ نہ صرف اس کے تحفظ کو یقینی بنائیں بلکہ اپنے تمام دیگر فرائض پر ترجیح دیں کیونکہ ہمارا وطن ہے تو ہم ہیں ہم خوش قسمت ہیں کہ ایک آزاد وطن میں آنکھ کھولی ایک اسلامی ملک میں زندگی گزارنے کا موقع ملا ہے اور اب نہ صرف ہمارے نیک وصالح اعمال ملی و قومی مقاصد بلکہ خود ہماری ہستی سے جڑی (وابستہ) ہر چیز ہماری جانیں، ہمارے جسم، ہمارے گھر بار، ہماری سلامتی، ہمارے بچے یعنی آنے والی نسلوں کی سلامتی اور روشن مستقبل اسی وطن سے وابستہ و پیوستہ ہے۔ کیونکہ وطن عزیز قائم ہے تو ہم ہیں اور زندگی گزارنے کے لیے ایک بہترین اور خوشحالی کا ماحول ہو گا تو ہم دین اسلام کی نہ صرف خدمت کر سکیں گے بلکہ اپنی قوم وملک کی تعمیر اور بہتری کے لیے بھی مواقع میسر کر سکیں گے۔

حقیقت میں یہ ملک حاصل ہی اللہ کے نام پر ہوا ہے اور اللہ کے احکامات کی سربلندی کی خاطر جان نشانی اور محبت سے کام کرنا اور اس کو قائم رکھنے کے لیے کوشاں رہنا ہی بطور قوم ایک اہم فریضہ ہے۔ جس طرح گھر رہنے والوں سے بنتا ہے اسی طرح وطن بھی رہنے والے لوگوں سے بنتا ہے اور یہ کہ بقول شاعر

یہی مقصود فطرت ہے یہی ہے رمز مسلمانی

اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی

سوال نمبر 4 :- کسی ایک نظمیہ جزو کی تشریح کریں۔

الف: تمہاری تیغ---------بڑھے چلو بڑھے چلو

تشریح:- اس بند میں شاعر قوم کے بہادروں سے مخاطب ہیں کہ تمہاری تیز تلوار پر وطن کو فخر ہے کیونکہ تمہارے حوصلے بلند ہیں ان حوصلوں کو پایہ تکمیل تک تمہاری تلوار ہی پہنچاتی ہے کیونکہ اس تلوار کے ذریعے تم نے دشمنوں کی صفوں کو تہس نہس کیا اور ملک و قوم کے دشمنوں کے سر قلم کر دیے اور ان کو شکست سے دوچار کیا۔ اگر تم نہ ہوتے تو وطن کی حفاظت کون کرتا بلکہ وطن کی بقا بھی تمہارے دم سے ہے کیونکہ وطن کی حفاظت کے لیے تم سیسہ پلائی دیوار بن جاتے ہو۔ اس لیے وطن کی زندگی اور موت کا انحصار تم پر ہے۔

بقول شاعر

شہیدانِ وفا کے حوصلے تھے دید کے قابل

وہاں پر شکر کرتے تھے جہاں پر صبر مشکل تھا

اے بہادرو! تم ہی وہ لوگ ہو جن میں وطن کی محبت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور تم وطن کی محبت میں بے قرار و بے چین رہتے ہو اور وطن کی خوش حالی، بقا، کامیابی و فتح تمہارے دم سے ہے اور وطن کی محبت میں اپنی جان ہتھیلی پر لیے ہوئے ہو۔

نثار کر دو اپنی جان وطن کے پاک نام پر

صدائیں دیتا ہے وطن بڑھے چلو بڑھے چلو

شاعر وطن عزیز کی محبت کے لیے یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ اگر میری قوم کے جوانوں کو وطن سے محبت ہے تو وہ کسی قسم کا خوف دل میں نہیں رکھتے بلکہ راستے میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے جذبہ ایمانی سے لڑتے ہیں تو پھر بڑھے چلو بہادرو! تلوار چلانے والو اپنی تلواروں کو استعمال کرتے ہوئے بڑھے چلو دشمن کی صفوں کو ختم کرنے والے بہادرو اور آگے بڑھو اور خاص طور پر اس وقت آگے، آگے ہی آگے بڑھتے جاؤ جب تمہارے وطن کو تمھاری ضرورت ہے اور مشکلات سے ہر گز نہیں گھبرانا۔

ملک و قوم کے بہادرو! اتمھارے حوصلے کبھی پست نہ ہونے پائیں۔ تمھارے جذبے تا ابد جواں رہیں۔ تم جب سر پر کفن باندھ کے نکلتے ہو تو دشمن کی صفوں میں خوف اور کپکپی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ تمھارا جذبہ شوقِ شہادت ہی ملک و قوم کی سلامتی کا ضامن ہے۔ تم ایسے جری سپاہی ہو جو ملک و قوم کی خاطر جان تک نچھاور کر دیتے ہو کیوں کہ تمھیں اِس بات کا یقین ہوتا ہے کہ:

شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

لہو جو ہے شہید کا وہ قوم کی زکواۃ ہے

(ب) فاطمہ تو آبرو کے امت----------شوق شہادت کس قدر

تشریح :-

حضرت علامہ اقبال ان اشعار میں فاطمہ بنت عبداللہ کے بارے میں لکھتے ہیں جو طرابلس کی جنگ میں زخمیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہوئی۔ اے فاطمہ تو امت مرحوم یعنی سوتی ہوئی امت کی عزت ہے شاعر یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ غفلت کی نیند سونے والوں میں اگر کوئی ایک بیدار ہو جائے تو اس غافل قوم کی قسمت جاگ جاتی ہے اور وہ قابل عزت ہو جاتی ہے کسی بھی قوم کی کوتاہیاں اور ناکامیاں اس وقت چھپ جاتی ہیں جب کوئی ایک چنگاری ہی چمک جائے۔

شاعر کہتے ہیں کہ تیری خاک کا ذرہ ذرہ بہت معصوم ہے کہ فاطمہ تو معصوم سی چھوٹی سی بچی ہے اور یہ جو تو مٹھی بھر خاک پر مشتمل ہے تو بہت معصوم ہے اور تیری یہ معصومیت ملت اسلامیہ کے لیے بہت ہی نمایاں اور بڑا کام کر گئی۔

حور صحرائی سے شاعر کی مراد عرب کی خوبصورت، معصوم لڑکی ہے چونکہ عرب علاقہ صحرا پر مشتمل ہے اس لیے یہ حور صحرائی یہ نیکی تیری قسمت میں تھی۔ ورنہ اور بھی بہت سے لوگ تمہارے ارد گرد تھے مگر سب کے سب کے لیے بے سود یہ تو شعور تیرے حصے میں آیا ہے کہ تو نے غازیانِ دین کو پانی پلانے کا ذمہ لے لیا۔ اصل میں یہ تو وہ وقت ہوتا ہے جب جنگ یا لڑائی کے بعد افراتفری سے کا وقت ہوتا ہے ہر ایک کو اپنی جان بچانے کی فکر پڑی ہوتی ہے اور اس مشکل وقت تو نے زخمیوں کو پانی پلانے کی ذمہ داری لے لی۔ حقیقت میں تو خوش قسمت ہے جو اللہ کا کرم ہے کہ تیری ذمہ داری تجھے نمازیوں کو پانی پلانے پر معمور کر دیا گیا۔ اور یہ بڑی عظیم ذمہ داری تھی جو خوش قسمتی سے تیرے حصّے میں آئی۔

شاعر نے فاطمہ کو آگ کی چھپی ایک چنگاری سے تشبیہ دے کر یہ واضح کر دیا ہے کہ جس طرح کسی سوئی ہوئی قوم کو خواب غفلت سے جگانے کے لیے کسی ایک ہیرو یا مرد مجاہد کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح تو بھی ایک ہیرو کی حیثیت رکھتی ہے۔

بقول شاعر

جو ابھی ابھرے ہیں ظلمت خانہ ایام سے

جس کی ضو نا آشنا ہے قید صبح و شام سے

فاطمہ بنت عبداللہ ایک ایسے ولولے اور جذبے کی علامت ہے جو قوموں کی بقا اور سلامتی کا ضامن ہوا کرتی ہے۔ پہلی عالمی جنگ میں مسلمانانِ عالم ایک امتحان اور آزمائش سے گزر رہے تھے۔ نظریاتی، فکری اور جغرافیائی طور پر عدم استحکام ملتِ اسلامیہ کا مقدر بنتا چلا جا رہا تھا۔ مایوسی، زوال اور ادبار نے ہر سمت ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ جذبہء جہاد اور شوقِ شہادت مفقود ہوتا چلا جا رہا تھا۔ نرگس اپنی بے نوری پہ نوحہ کناں تھی کہ فاطمہ بنت عبداللہ ایک روشن، تابناک اور درخشاں ستارے کی مانند طلوع ہوئی اور اپنی جان قربان کر کے، دیکھتے ہی دیکھتے دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت اختیار کر گئی۔ مسلم شعرا اور مفکرین نے فاطمہ بنت عبداللہ کی اس قربانی کو مستقبل کے وسیع تر تناظر میں دیکھا۔ فاطمہ بنت عبداللہ جس جذبے سے سرشار تھی وہ امتِ مسلمہ کی بیداری کا باعث بنے گا اور ایک بار پھر امتِ مرحومہ، عظمت و جلال اور فتح و نصرت کی منزل کو پانے کے لیے سرگرمِ عمل ہو جائے گی۔

سوال نمبر5: درج ذیل غزلیہ اشعار کی تشریح کریں۔

جواب:- تشریح:

الف: جنہیں میں ڈھونڈتا---------- مکسینوں میں

علامہ اقبال اِس شعر میں تلاش و جستجو کا فلسفہ پیش کر رہے ہیں کہ انسان بنیادی طور پر کوتاہ فہم ہے۔ انسان قریب کی بجائے بعید پر نظریں جمائے رہتا ہے۔ اندھیروں میں ٹکریں مارتا پھرتا ہے بالآخر تھک ہار کر جب فکر و تدبر کرتا ہے تو اُسے اپنے اندر ہی ایک روشن چراغ دکھائی دیتا ہے۔ پھر اسے حیرت ہوتی ہے کہ جس عظیم المرتبت ہستی کی تلاش میں وہ دنیا بھر میں مارا مارا پھر رہا تھا وہ تو اس کی شہ رگ سے بھی قریب ہے اور وہ ذاتِ بابرکات اُس کے دل ہی میں موجود ہے:

بقول شاعر

میں اس کو کعبہ و بت خانے میں کیوں ڈھونڈنے نکلوں

میرے ٹوٹے ہوئے دل ہی کے اندر ہے مقام اس کا

یہاں شاعر نے بت خانہ دل کے مکینوں کہہ کر بھی یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ جب انسان کا دل اس کے نور سے منور ہو جاتا ہے تو اندھیرا چھٹ جاتا ہے حضرت علیؓ کا قول ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔ گویا رب کائنات کو تلاش کرنا ہے تو اپنے اندر ہی تلاش کیا جائے وہ رب مل جاتا ہے وہ کہتے ہیں نا کہ اللہ تعالیٰ تو شہ رگ سے بھی قریب ہے وہ اس بات کو زیادہ قوی بنا دیتا ہے۔

بقول شاعر

ڈھونڈتے ہیں آپ سے اس کو پرے

شیخ صاحب چھوڑ گھر باہر چلے

انسان اپنے رب کو تلاش کرنے کے لیے مسجدوں، مدرسوں، جنگلوں اور پہاڑوں میں پھرنے کی بجائے اپنے دل کے تہہ خانوں میں تلاش کرے کیوں کہ انسانی دل میں جب اللہ کی سچی محبت بسیرا کر لیتی ہے تو پھر دنیاوی اشیا کی محبت خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔

ارض سماء کہاں تیری وسعت کو پا سکے

میرا ہی دل ہے جہاں تو سما سکے

(ii) : کبھی اپنا بھی نظارہ------ محمل نشینوں میں 6

شاعر نے اس شعر میں صنعت تلمیح کا استعمال کیا ہے۔ لیلیٰ مجنوں کی رومانوی داستان کے ذریعے خود شناسی اور خود آگاہی کا درس دیا ہے۔

مجنوں کا اصل نام تو قیس تھا لیکن لیلیٰ کے عشق میں بے حال ہو کر مجنوں ہو گیا۔ گویا صحراؤں، جنگلوں، بیابانوں کی طرف جا نکلا۔ ویسے بھی عشق تو اتنا آسان نہیں ہوتا، طرح طرح کی مصیبتیں اور اذیتیں سہنی پڑتی ہیں جن سے عاشق کی جان ہلکان ہو جاتی ہے۔

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں

تیرے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

عشق کا اگلہ مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ سب کچھ کر گزرنے کے باوجود بھی نارسائی کا ایک دھڑکا اور اندیشہ ہمہ وقت دامن گیر رہتا ہے۔ جو ہجر اور فراق کی اذیت میں مزید اضافے کا باعث بنتا ہے لیکن عاشق اگر سچا ہے تو یہ سب اُسے ہنس کر کہنا پڑتا ہے:

یہ عشق نہیں آساں، بس اتنا سمجھ لیجیے

اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

اِن تمام باتوں کے باوجود شاعر اِس بات کا قائل نظر آتا ہے کہ مجنوں یوں صحرا نوردی اپنانے کی بجائے خود اپنی ذات پہ غور و فکر کر لیتا تو کام بن جانا تھا۔ اُس کی اپنی ذات کی رنگا رنگی اور رعنائی ہی اُس کا دِل بہلانے کو کافی تھی۔ اُسے کسی لیلیٰ کی ضرورت نہ تھی۔ خود آگاہی اور خود شناسی ایسی دولت ہے کہ اگر ہاتھ آجائے تو انسان کا دِل دنیا کی تمام لذتوں سے غنی ہو جاتا ہے۔

(iii) مہینے وصل کے-------ہیں مہینوں میں

تشریح: شاعر اس میں ہجر و فراق اور انتظار کی تکلیف نیز وصال کے لمحات کا ذکر کرتا ہے کہ محبوب سے وصل کا وقت تیزی سے گزرتا ہے اور اس وقت کے گزرنے کا احساس نہیں بالکل ایسے ہی جیسے انسان خوش ہو تو خوشی کے لمحات گزرنے کا وقت تیزی سے گزرتا ہے اور اس بات کا ہوش نہیں رہتا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے اور کتنا باقی رہ گیا ہے اس بات کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب جدائی کا فراق کا وقت شروع ہوتا ہے۔

بقول شاعر

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی

مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

شاعر کی مراد یہ ہے اگر محبوب کو یاد نہ کروں تو وقت گزر بھی جاتا ہے لیکن جب یاد آتا ہے تو پھر بھول نہیں سکتا کیونکہ اُسے وہ وصل اور ملاپ کی گھڑیاں یاد آتی ہیں یہ حقیقت ہے کہ خوشی کے لمحات میں انسان کو وقت کا احساس نہیں ہوتا لیکن یہی وقت جدائی کا ہوتا ہے تو کاٹے نہیں کٹتا حالانکہ وقت گزرنے کی رفتار وہی ہوتی ہے۔

بقول شاعر

ایام مصیبت کے تو کاٹے نہیں کٹتے

دن عیش کی گھڑیوں میں گزر جاتے ہیں کئی

عاشق ہر لمحہ محبوب کے وصال کے لیے دعا گو رہتا ہے لیکن اس رفاقت اور قربت میں گزرے لمحات اتنے مختصر ہوتے ہیں کہ عاشق کو یوں لگتا ہے کہ ابھی پلک جھپکی ہو۔

سوال نمبر5: حصہ (ب)

تشریح:-

(i) شاعر اس شعر میں اپنی بے یقینی کی صورتحال کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ بتوں کے دلوں میں رکھے شک و شبہات پیدا کر دیئے ہیں کہ دل سے خوف خدا ختم ہو گیا ہے شاعر اس بات کا شک میں ہی ذکر کرتا ہے اور وہ بے یقینی جو خدا پر یقین نہ رکھنے والا کوئی بھی شخص کر سکتا ہے یا اس کا مرتکب ہو سکتا ہے اس صورت میں ممکن ہے کہ اسکو خدائے بزرگ و برتر پر یقین کامل نہ ہو۔ اور ہر روز جو قیامتیں ٹوٹتی ہیں اس کے خیال سے جزا کے دن کا خوف ہی جاتا رہا کہ یہ اپنے یقین کے متزلزل ہونے کی وجہ سے اتنا ڈر گیا ہوں کہ روز قیامتیں آجاتی ہیں اور ان قیامتوں کی وجہ سے جو اصل روز جزا و سزا ہے اس کا خیال مدہم پڑ گیا ہے۔

شاعر انسان کو خبردار کر رہا ہے کہ اگر اللہ کے سوا دوسرے سہاروں کی طرف توجہ دو گے۔ تو خسارا ہی خسارا ہو گا۔ کائنات کی ہر شے انسان کو یہ درس دے رہی ہے کہ اِسے اللہ تعالیٰ ہی کی ذات برکات نے خلق کیا ہے:

بقول شاعر

گواہی دے رہی ہے اس کی یکتائی پر ذات اس کی
دوئی کے نقش سب جھوٹے ہیں اک سچا ہے نام اس کا

شاعر کا خیال ہے کہ سب باتیں حقیقت ہیں پر جب شیطانی وسوسے چھا جاتے ہیں تو انسان بہکنے لگتا ہے۔

(ii) شاعر اس شعر میں کہتا ہے کہ اب تو رت ہی بدل گئی ہے موسم بہار کا رنگ بھی وہ نہیں رہا اور نہ ہی بہار کے بادل کا وہ طریقہ اور برسنا ہے کہ جب شاعر اپنی غزلوں میں ذکر کرتے تھے تو بقول شاعر

اے ابر کرم آج اتنا برس
اتنا برس کہ وہ جانہ سکیں

شاعر کا خیال ہے زمانے کے حالات کے مطابق ہی بہار کا بادل اور موسم بہار میں تبدیلی آتی ہے اور اس بات سے واضح ہے کہ چونکہ موسم اور بادل کا مزاج بدل جاتا ہے تو محبوب کا مزاج بھی بدل جاتا ہے وہ ادا بھی ایسی تھی جس سے محبوب واقف تھا آشنا تھا وہ صبح کی ہوا کا مزاج بھی گیا وہ بھی ختم ہو گیا یعنی شاعر کے دل کا موسم جیسا ہو ویسا ہی اس کو نظر آتا ہے۔

دل تو میرا اداس ہے ناصر

شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

شاعر کہتا ہے موسم جیسا بھی ہو دل کا موسم خوشگوار ہو تو سب ٹھیک لگتا ہے لیکن جب دل کا موسم ٹھیک نہ ہو تو پریشانی و غم ہوں تو پھر دنیا میں کچھ بھی اچھا نہیں لگتا

(iii) شاعر اس آخری شعر میں لکھتا ہے۔ جو وفا کا وعدہ کیا وہ طلب کرنے پر کیا تو اس کی وسعت جاتی رہی کیونکہ جو دعویٰ کرنے والے تھے وہ جب سر عام ہوئے تو سامنے آ گئے تو وہ اب جو کسی طرح ہمارے حصے میں آتا وہ یہیں ختم ہو گیا۔

بقول شاعر

تیرے وعدے پہ جیئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا

کہ خوشی سے مر نہ جائے اگر اعتبار ہوتا

اس شعر میں شاعر یہ واضح کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ الفت اور چاہت خود بخود ہو تو دیرپا ہوتی ہے لیکن کہہ کر ہی منوانا ہو مطالبہ کر کے ہی اس بات پر لانا ہو تو ہر محبت عارضی اور غلط لگتی ہے کیونکہ بقول شاعر انسان کی عزت جاتی رہتی ہے۔ جب وہ خود مانگ کر کسی چیز کی خواہش کرتا ہے وہ محبوب ہی کیوں نہ ہو۔

سوال نمبر6: ایک کرسی کی آپ بیتی تحریر کریں۔

جواب:- ایک کرسی کی آپ بیتی

کسی بھی لکڑی یا دھات کی بنی کرسی پر بیٹھنے کا ارمان ہر ایک کو ہوتا ہے اور یہ کرسی اگر اقتدار کی ہو تو پھر یہ خواب شاید ہی شرمندہء تعبیر ہو۔ میری ظاہری صورت جو آپ کو دکھائی دے رہی ہے کبھی اس کی چمک دمک بھی ایسی تھی کہ نظر کو خیرہ کر دیتی۔ میرا یہ حال جو ہوا ہے ماہ و سال گزرنے کے بعد ہوا ہے۔ میں لکڑی سے بنی ہوں وہ لکڑی جو درختوں سے حاصل ہوتی ہے ظاہر تو آپ کو میری صورت دیکھ کر ایسا احساس نہیں ہوتا ہو گا مگر یہاں پہنچنے تک مجھے جن مراحل سے گزرنا پڑا ہے وہ آپ سن لیں تو کانوں کو ہاتھ لگائیں۔ مجھے یاد ہے کہ وہ بہار کے دن آنے والے تھے۔ میں اک درخت کا حصہ تھی اور سب سے لمبا حصہ جو کبھی لہلہاتا اور جوبن پر ہوتا پھر اچانک کسی کی نظر لگ گئی اور میرا عروج زوال پذیر ہو

گیا لکڑہارے نے درخت کاٹ کر زمین سے الگ کر دیا۔ میرا رشتہ زمین سے ختم ہو گیا اور دلدوز چیخیں نکلیں مگر لکڑہارے نے کسی چیز کی بھی پرواہ نہ کرتے ہوئے ایک شخص کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ اس شخص نے خرید کر مجھے ایک تالاب یعنی پانی میں ڈال دیا اور میں وقت کے تھپیڑے کھانے لگی گرم سرد پانیوں میں مجھے نہانے میں ملزموں پر ہونے والے تشدد کا خیال آنے لگا۔ ایک برس بعد میری سنی گئی اور ایک خریدار نے مجھے اس گدلے پانی سے نکالا۔ میں بڑی خوش ہوئی اس نے مجھے آرا مشین میں جا کر میرے حصے کر دیے۔

اس دل کے ٹکڑے ہزار ہو گئے

کوئی یہاں رہا کوئی وہاں گرا

شام کے وقت میرے ٹکڑے گاڑی میں لاد دیئے گئے گھنٹوں کے طویل سفر کے بعد ایک پلیٹ فارم پر جا رکے۔ وہاں پر جو عملہ تھا اس نے مجھے زمین پر پٹخ دیا یعنی میرے ٹکڑوں کو زمین پر پٹخ دیا اور مجھے لگا میرے غم اور پریشانیاں ختم ہونے والی نہیں ہیں۔

یہاں میری درجہ بندی کی گئی اور کچھ ٹکڑوں کو الگ کر کے باقی ٹرک میں لاد کر ایک فیکٹری میں بھیج دیا گیا۔ یہاں میرے مزید ٹکڑے کیے گئے۔ کہتے ہیں دنیا پھولوں کی سیج نہیں لیکن اتنی ظالم ہے یہ دنیا، یہ تو معلوم ہی نہیں تھا۔ پھر ان سب ٹکڑوں کو باریک کر کے کرسی کی شکل دی گئی ان سب کو مزید نرم و ملائم کر کے بہت سے حصوں کو آپس میں جوڑا گیا اور میں اپنے دکھوں کو روتی رہی کچھ دیر بعد ایک شخص ایک آیا اور میرے جڑے ہوئے وجود پر کچھ پھیرنا شروع کر دیا۔ شروع میں تو مجھے تکلیف ہوئی لیکن پھر اپنی چمک دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ میں ایک خوبصورت کرسی بن گئی تھی۔ اب میں کسی کے گھر کی زینت تھی ہر چھوٹا بڑا خاص و عام میرے اوپر بیٹھتا تھا۔ سمارٹ اور دبلے پتلے لیکن بعض اوقات بہت ہی بھاری بھر کم آ بیٹھتا تو میں آہوں کی شکل میں احتجاج کرتی اور پھر آہستہ آہستہ میرا رنگ روپ بھی بدلنے لگا بلکہ بکھرنے لگا۔

آخر کار وہ وقت بھی آ گیا جب ان کی ضرورت پوری ہوئی اور مجھے بیکار سمجھ کر سٹور روم میں پھینک دیا۔ میری حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ کچھ ہی عرصے بعد میرے جسم کا ہر حصّہ جواب دے گیا۔ اتنے سالوں کے بوجھ تلے آ کر بالآخر میری ایک ٹانگ بھی ٹوٹ گئی تھی۔ کاٹھ کباڑ کے جس تاریک کمرے میں مجھے پھینکا گیا وہاں مجھ سی کئی اور میری ہم جنس ایک عرصے سے قیام پذیر تھیں۔ اتنی اچھی زندگی گزارنے کے بعد اس تنگ و تاریک کمرے میں میرا دم گھٹنے لگا تھا لیکن حالات کے جبر کو تو سہنا ہی تھا۔ مایوسی، تنہائی اور فکروں نے آگھیرا کہ اب ہمارا مستقبل کیا ہو گا۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے:

دائم آباد رہے گی دنیا

ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہو گا

سوال نمبر 7 :- کسی ایک عنوان پر مضمون لکھیۓ؟

جواب: ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے

اسلامی دنیا اور پاکستان ایک انتہائی نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ گو ہر مسلمان کا دل اس جذبے سے سر شار ہے کہ وہ عظمت اسلام کی بحالی کے لیے کچھ نہ کچھ کر گزرے گا۔ لیکن حقائق اور واقعات کی تصویر یہ ہے کہ عالم اسلام میں اختلافات کی خلیج روز بروز گہری ہوتی چلی جا رہی ہے ۔دوسری طرف کفر جو "ملت واحدہ" ہونے کی حیثیت سے ہر اسلامی ملک کے دینی تشخص کو ختم کرنے کے درپے ہے اور عالم اسلام کی نظریاتی بنیادوں کو مسمار کرنے کے لیے ہر طرح کے جدید اسلحے سے لیس ہے۔ کبھی وہ قومیت کے نام پر مسلمان کو مسلمان سے لڑاتا ہے اور کبھی ثقافت کے نام پر رسم و رواج اور عادات کو اسلامی معاشرے کی بنیاد بنا کر اِسے متزلزل کر رہا ہے۔ اسلام کے بدترین دشمنوں نے پہلی جنگ عظیم میں ترکی کی خلافت کو ختم کیا۔ عرب ملکوں کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے اتنی چھوٹی چھوٹی حکومتیں بنائیں کہ عالم اسلام کے اس مرکزی خطے کی طاقت کبھی کفر کے مقابلے میں ایک نہ ہو سکی۔ یہی وہ عالم اسلام کے نام نہاد خیر خواہ ہیں۔ جنہوں نے فلسطینیوں کے مقابلے میں اسرائیل کی ہر ممکن سرپرستی کی ۔ اور انھیں ان کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا۔ عراق کو ایران اور عربوں سے لڑایا۔ اسلامی سربراہوں کے خلاف اندرون ملک بغاوتیں کروائیں ان کی حکومت کو کمزور کیا اور پاکستان جیسے اسلام کا قلعہ سمجھا جاتا تھا دو لخت کر دیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عالم اسلام کی پستی کا علاج کیا ہے امت مسلمہ پستی اور ذلت کی اس کیفیت سے کیونکر نکل سکتی ہے۔اس مسئلے پر غور کیا جائے اور خدا عقلِ سلیم بھی دے تو فوراً قرآن ہماری رہنمائی کرتا ہے اور کہتا ہے۔

"تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے آپس میں تفرقہ ڈالا اور باہم تنازع کیا جب ان کے پاس واضح احکام پہنچ چکے"

قرآن حکیم عالم اسلام کی توجہ اس طرف مبذول کرا رہا ہے کہ امت مسلمہ کی تمام مصیبتوں کا علاج اتفاق و اتحاد میں ہے اور اس اتحاد کی بنیاد رنگ و نسل اور لسانی ہم آہنگی نہیں بلکہ وہ رشتہ وحدت ہے جسے رسالت مآب صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے کلمہ طیبہ کی بنیاد پر قائم کیا۔ اس لیے قرآن نے فرمایا کہ "مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں" ان بھائیوں میں اختلاف و نفاق نہیں ہونا چاہیۓ کیونکہ اختلاف و نفاق ایسا موذی مرض ہے جس سے قوموں کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اس لیے اقبال نے بھی اپنے ایک شعر

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے

نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

میں امت مسلمہ کے سیاسی عروج کے لیے جو کلمہ پیش آیا وہ ملت اسلامیہ کا اتحاد و نفاق ہے۔ اسی لیے اقبال رنگ و نسل اور جغرافیائی حد بندیوں کی بنیاد پر کیے جانے والے امتیازات کو ملت اسلامیہ کی حیاتِ نو کے لیے مضر خیال کرتا ہے اور کہتا ہے کہ

یہ ہندی وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی

تو اے شرمندہ ساحل، اچھل کر بیکراں ہو جا

علامہ مرحوم نے ملتِ اِسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کے لیے اِسلامی تشخص کی وحدانیت پر بڑا زور دیا تھا:

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ عالم اسلام اگر وحدت کے رشتے میں منسلک ہو جائے تو وہ ایک قوت کی صورت میں ابھر سکتا ہے جسے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے سرخ و سفید سامراج کے عیارانہ سہاروں کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ ہر ایک سازش کا مقابلہ اپنے قوت بازو سے کر سکتا ہے یہ وہ اتحاد تھا جسکی بنا پر آج سے چودہ سو سال پہلے مسلمانوں نے عظیم ترین حکومتوں کا تختہ الٹ کر ان کے استبداد کو نابود کر دیا تھا۔ اسی امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا کہ

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے

وہ کیا تھا زورِ حیدرؓ فقر بوزرؓ صدق سلیمانیؓ

اپنی بقا اور عالم اسلام کی سربلندی کے لیے ہمارے پاس پہلے ایک راستہ ہے کہ ہم اپنے مذہبی، علاقائی، لسانی اور سیاسی اختلاف کو ختم کر کے ملت اسلامیہ کے دشمنوں کے خلاف متحد ہو کر ایک ایسی سیسہ پلائی دیوار بن جائیں جس سے ٹکرا کر ہر دشمن خود پاش پاش ہو جائے۔ عمارت ایک ہے اور ہم سب اس عمارت کی ایک اینٹ ہیں۔ جب تک ایک اینٹ دوسری اینٹ سے پیوست نہیں ہو گی عمارت کا قیام مشکوک رہے گا۔ اگر ہم نے دین کی رسی کو مضبوطی سے نہ تھاما تو ہماری ہوا اکھڑ جائے گی اور ہم خشک پتوں کی طرح بکھر کر رہ جائیں گے۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں

موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

طلبہ اور تعمیرِ وطن

کون ہے جسے اپنے وطن سے محبت نہیں ہوتی۔ یہ حقیقت ہے کہ اپنے وطن سے ہر شخص کو محبت ہوتی ہے۔ وطن کے نام پر ہر شہری مر مٹنے کو تیار ہوتا ہے اور یہی جذبہ زندہ قوموں کا طرہ امتیاز ہوتا ہے۔ وطن کی تعمیر و ترقی کا جذبہ قوموں کے خیالات و عمل کا ایک عظیم سرمایا ہے۔ زندگی بحیثیت ایک قوم کے وطن کے دامن میں ابھرتی اور نکھرتی ہے۔ اصل میں وطن اور قوم لازم و ملزوم ہیں۔ قوم کی زندگی کے لیے وطن کا استحکام لازم ہے۔

پاکستان کو مضبوط اور مستحکم بنانے کی ذمہ داری کسی ایک فرد پر عائد نہیں ہوتی بلکہ ہر اس فرد پر عائد ہوتی ہے جو اس مادر وطن کا سپوت کہلاتا ہے اور یہاں آزادی سے رہتا ہے۔ پاکستان ہمارا وطن عزیز ہے۔ یہ ہماری امیدوں کا محور اور مرکز ہے۔ اس کے لیے کام کرنا اس کی ترقی و تعمیر میں حصّہ لینا ہر ذی ہوش پاکستانی کا فرض ہے۔ اس فہرست میں طلبہ بھی شامل ہیں۔ طلبہ کا طبقہ ملک کا بہترین سرمایہ اور اس کے روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔ ملک کی آئندہ ترقی کا انحصار انہی کی سوجھ بوجھ اور انہی کی محنت پر ہوتا ہے۔ کیونکہ آج کے نوجوان کل کے نہایت ذمہ دار افراد کہلائیں گے۔

طالب علمی کا زمانہ طلبہ کے لیے ذہنی پختگی حاصل کرنے کا ہوتا ہے۔ اس دور میں انھوں نے اپنی تعلیم مکمل کرنا ہوتی ہے۔ اور انھیں یکسوئی اور سکون کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر وہ کسی ہنگامہ آرائی کا شکار ہو جائیں اور اپنے اصل فرائض کو پس پشت ڈال دیں۔ تو حصول تعلیم کا فریضہ سر انجام دیں۔ ان کی توجہ صرف تعلیم کی طرف ہونی چاہئے انھیں چاہئیے کہ نظم و ضبط کی پوری طرح سے برقرار رکھیں۔ انھیں ملکی سیاست سے تاوقتیکہ کوئی ہنگامی حالات پیدا ہوں دور رہنا چاہیے۔ البتہ اپنے تعلیمی مطالبات منوانے کا حق ضروری ہے۔ مگر وہ بھی اس شکل میں کہ کسی ہنگامہ آرائی کے بغیر۔ وہ اپنے مطالبات و تجاویز صاحبان بست و کشاد کے آگے پیش کر سکتے ہیں۔ اور چونکہ ان کو ان کی ضروریات اور اپنے وسائل کا زیادہ پتہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کا فیصلہ بھی ان ہی پر چھوڑ دینا زیادہ بہتر ہو گا۔

طلبا کو چاہیے کہ ملک کی فلاحی تنظیموں میں حصہ لیں اور رفاہی کاموں میں حصّہ لے کر وطن کی خدمت کا فریضہ سر انجام دیں۔ انھیں چاہیے کہ ایسی تنظیمیں بنائیں جو ناخواندہ افراد کو تعلیم دیں۔ اپنے گردوپیش کے ماحول کے لوگوں میں جذبہ حب وطن کا احساس دلائیں۔ تاکہ قوم میں وطن کے لیے ایثار و قربانی کا جوہر تازہ رہے لوگوں کی توجہ صحت و صفائی کی طرف مبذول کراتے ہیں۔ وہ ان میں ایک صحت مندانہ ذہن پیدا کر سکتے ہیں ۔ جس سے خود غرضی اور حق تلفی کے رجحانات ختم ہو سکتے ہیں۔ اس طرح وہ عوام میں زندہ قوموں کا سا جذبہ پیدا کر سکتے ہیں ۔

مقام افسوس ہے کہ طلبہ کی اکثریت اعلیٰ ملازمتوں اور حصول زر کے لیے تعلیم حاصل کرتی ہے ۔ ان کا نظریہ بہت بلند ہونا چاہیے۔ وہ اگر قوم کی خدمت کے جذبے سے تعلیم حاصل کریں۔ تو ان کے اپنے مقاصد بھی حاصل ہو سکتے ہیں اور وہ ملک کی خدمت کا مقدس

فریضہ بھی انجام دے سکتے ہیں۔ طلبا کو اپنی ذہنی صلاحیتوں اور رجحانات کے مطابق مضامین کا انتخاب کرنا چاہیے۔ اس سے وہ زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں اور قومی ترقی کے مختلف دائروں میں اپنی صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لا سکتے ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے جوش شباب سے کام لیا جائے۔ ان پر توجہ دی جائے اور ان کے حب وطن کے جذبے کو ابھار کر ان کے لیے لائحہ عمل متعین کیا جائے ۔ اگر ایسا کر لیا جائے تو وہ اعلیٰ کردار کے مالک بن کر ملک و قوم کے لیے عظیم سرمایہ ثابت ہو سکتے ہیں یہ ہماری رہنمائی پر منحصر ہے کہ ہم انھیں کس راہ پر چلاتے ہیں۔ اگر ہم انھیں سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں تو ان کا قیمتی وقت اور مستقبل ہمیشہ کے لیے ضائع ہو جائے گا۔ اور قوم انمول موتیوں سے محروم ہو جائے گی۔ اور اگر ہم ان کو اسی راہ پر چلائیں گے ۔ جس سے وہ اپنا تعلیمی فریضہ احسن طریقہ سے انجام دے سکیں ۔ تو وہ ملک کے لیے ذریعہ استحکام اور ذریعہ خدمت عوام ثابت ہوں گے۔

انٹرنیٹ ایک حیرت انگیز سائنسی ایجاد

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بے شمار علی اور فکری صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ قرآن نے بار بار انسان کو کائنات پر غوروفکر کرنے کی تلقین کی ہے ۔ انسان اشرف المخلوقات ہے ۔ اللہ نے دنیا اس کے لیے بنائی ہے کہ انسان اس پر غوروفکر کرے اور اسے مسخر کرے ۔ سائنس اسی تدبر ، مشاہدے، تجربے اور نتیجے کا نام ہے۔ یہ تسخیر کائنات کا ذریعہ ہے اگر انسان اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی خوبیوں کو بروے کار لاتا تو اس کی حالت میں تبدیلی ممکن نہیں تھی ۔

مرے ذوق تسخیر فطرت کے آگے

عناصر کا قلب و جگر کانپتا ہے

تمام تر سائنسی ایجادات میں سب سے زیادہ موثر اور حیرت انگیز انٹرنیٹ ہے۔ انٹرنیٹ کمپیوٹر کا ایک بہت ہی بڑا کا نیٹ ورک جو پورے کرہ ارض پر محیط ہے ۔ اس میں لاکھوں کمپیوٹروں کو مواصلاتی ذرائع سے آپس میں منسلک کر دیا جاتا ہے جن کے ذریعے پورے کرہ ارض کے رہنے والے آپس میں معلومات کا تبادلہ کر سکتے ہیں آج کے دور میں انٹرنیٹ نے بہت شہرت اختیار کر لی ہے مگر یہ ۱۹۷۱ء کے عشرے کی ایجاد ہے جس کا سہرا امریکہ کے سر ہے ۔ بقول مرزا غالب

بہت سارے کاروباروں میں آپس میں رابطے کے لیے انٹرنیٹ بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے بلکہ ایک حد تک ضروری ہو گیا ہے۔ کمپنیاں اپنی مصنوعات اور ان کی قیمتوں کو بین الاقوامی منڈیوں میں متعارف کروانے اور اشتہار بازی کے لیے انٹرنیٹ کا استعمال کرتی ہیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ کاروباری لین دین اور تجارت کے لیے آپ گھر بیٹھے دنیا کی کسی تجارتی منڈی یا مارکیٹ میں اس کے ذریعے اپنی پسند کا مال خرید سکتے ہیں ، بیچ سکتے ہیں ، مختلف اشیاء کو پسند کر سکتے ہیں اور اپنے آرڈر بک کروا سکتے ہیں ۔

انٹرنیٹ کا نہایت اہم فائدہ یہ ہے کہ اس میں معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ پوشیدہ ہے جس سے فائدہ اٹھا کر لوگ گھر بیٹھے بیٹھائے پوری دنیا کے لوگوں سے محبت اور خلوص کے رشتے استوار کر سکتے ہیں ۔ علمی تحقیق کے افق پر داد تحقیق دے سکتے ہیں کسی بھی ملک کے کسی بھی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ اور امتحان دے کر مطلوبہ ڈگری حاصل کر سکتے ہیں ۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

یہ درست ہے کہ تعلیم کی دنیا میں انٹرنیٹ سے جو انقلاب آیا ہے اس کے بے شمار فائدے ہیں ، روابط کی دنیا میں جو بہتری آئی ہے اس کے منافع بھی مسلم ہیں معلومات کے تبادلے میں جو انقلاب آیا ہے اس کا بھی جواب نہیں مگر اس کے کچھ نقصانات بھی ہیں جس سے لوگ آئے دن دوچار ہوتے رہتے ہیں ۔ مثلاً انٹرنیٹ کے آگے بیٹھنے والوں کے دوسرے معمولات زندگی نظر انداز ہو جاتے ہیں اور اس کا نشہ انھیں زندگی کے دوسرے معا ملات سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

زندگی نیچے کہیں منھ دیکھتی ہی رہ گئی

کتنا اونچا لے گیا جینے کا معیار آدمی

انٹرنیٹ کے لیے کوئی اخلاقی معیار یا ضابطہ متعین نہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ فحاشی کی ترویج و اشاعت میں اس کا کردار نمایاں ہوتا جا رہا ہے گویا جہاں معلومات تک رسائی آسان ہوئی وہیں نو عمر افراد کو اس کی اخلاق باختگی سے بچانے کی کوئی صورت نہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سی معاشرتی اور اخلاقی برائیاں جنم لے رہی ہیں جس سے یہ دنیا جہنم زاد بنتی جا رہی ہے

آدمی ظلمتوں میں ڈوب گیا

چاند تارے رہے تماشائی

بہت سے ہیکرز مختلف اداروں یا افراد کے ڈیٹا کو وائرس کے ذریعے تباہ کر دیتے ہیں یا ان کی معلومات چرا کر انھیں بلیک میل کرتے ہیں ۔ اب تو انٹرنیٹ کے ذریعے فراڈ اور جعل سازی کے قصے بھی اخبارات کے ذریعے منظر عام پر آ رہے ہیں۔ بعض شاطر قسم کے لوگ دوسروں کے کریڈٹ کارڈز کا استعمال کر کے ان کا بینک بیلنس اپنے اکاؤنٹ میں منتقل کروا لیتے ہیں اور اسطرح بہت لوگ لٹ جاتے ہیں۔

بستیاں چاند ستاروں کی بسانے والو

کرہ ارض پر بجھتے چلے جاتے ہیں چراغ

انٹرنیٹ کے بے شمار نقصانات ہیں اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس کا استعمال جرائم پیشہ افراد بہت زیادہ کرتے ہیں چونکہ انٹرنیٹ ایک عالمی نیٹ ورک ہے اس لیے جرائم پیشہ گروہ اسے عالمی رابطوں ، بلیک مارکیٹنگ ، سمگلنگ اور بلیک میلنگ کے لیے استعمال کرتے ہیں ۔

ایسی تاریکیاں آنکھوں میں بسی ہیں کہ فراز

رات تو رات ہے ہم دن کو بھی جلاتے ہیں چراغ

آخر میں یہ بات بلا خوف و تردید کی جا سکتی ہے کہ انٹرنیٹ کے حق میں اور اس کے خلاف بہت سے دلائل دیئے جا سکتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ دوسری سائنسی ایجادات کی طرح اس کی افادیت اور مضرت کا انحصار استعمال کرنے والے کے اپنے ذوق اور انتخاب پر موقوف ہے جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ اسلام کی روح سے بھی چیزیں بذات خود اچھی یا بری نہیں ہوتیں بلکہ ان کا استعمال اچھا یا برا ہوتا ہے۔

میرا پسندیدہ ناول نگار

نثر ہو یا نظم انسان کی پسند اپنی اپنی ہوتی ہے میں نے بہت سے مصنفین کی تحریروں کا مطالعہ کیا لیکن سب سے منفرد انداز نسیم حجازی صاحب کا پایا، اور ان کی تحریروں کی اسی خوبی کی وجہ سے وہ میرے پسندیدہ ناول نگار ہیں۔

نسیم حجازی صاحب کی زندگی کی ابتدائی حصہ مشرقی پنجاب میں گزرا۔ تقسیم کی بعد ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور ایبٹ آباد میں مستقل طور پر قیام پذیر ہو گئے۔

ابتدا میں انہوں نے بعض ساتھیوں کے ساتھ مل کر روزنامہ ' تعمیر ' اور روزنامہ 'کوہستان' جاری کیا۔ نسیم حجازی صاحب کوہستان کے مدیر اعلی رہے اور طویل صحافی زندگی کے بعد انہوں نے صحافت سے علیحدگی اختیار کر لی۔

نسیم حجازی صاحب کا پہلا ناول داستان مجاہد کے نام سے قیام پاکستان سے قبل شائع ہوا۔ اس کے بعد یکے دیگرے ان کے کئی شہرہ آفاق ناول منظر عام پر آ گئے جن میں 'انسان اور دیوتا' محمد بن قاسم' یوسف بن تاشقین' آخری چٹان' خاک اور خون اور تلوار ٹوٹ گئی وغیرہ شامل ہیں۔

آپ کے ناولوں کا موضوع اسلام رہا۔ قصری و کسریٰ اور قافلہ حجاز کا پس منظر قرن اول سے متعلق ہے۔ شاہین اندھیری رات کے مسافر اور یوسف بن تاشقین میں ہسپانیہ پر مسلمانوں کے دور حکومت کے وسطی اور آخری سالوں کی کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔

نسیم حجازی ناول نگاری میں عبد الحلیم شرر کی روایت سے تعلق رکھتے ہیں۔ مقصدی اعتبار سے وہ اپنی ڈپٹی نذیر احمد کی طرح کی ہم پہلو اصلاح چاہتے ہیں وہ اسلاف کے کارنامے بیان کر کے ان کے اندر مذہبی ملی اور قومی جوش وولولہ پیدا کرنا چاہتے ہیں تا کہ مسلمان نوجوان اکابر کی عظمتوں اور رفعتوں کے امین بن سکیں۔ ان کے ناول مقصدیت اور روحانیت سے بھرپور ہیں۔

آپ قارئین کو اسلام سے محبت، عشق رسولؐ دین کی سربلندی، اکابر اسلام کی تقلید، مذہبی محبت اور روحانیت واقدار سے جذباتی وابستگی پر ابھارتے ہیں۔

نسیم حجازی صاحب نے اپنے ناولوں میں مسلمانوں کے اسلامی جذبات کے ترجمانی کی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے ناول لوگوں میں بے حد مقبول ہوئے۔

وہ ناول میں ایسا رنگ بھر دیتے ہیں کہ انسان اسی زمانے میں چلا جاتا ہے اور ناول پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کا حصہ بنتا چلا جاتا ہے۔

الغرض نسیم حجازی صاحب ان ہی خصوصیات کی وجہ سے اپنے عصر کے تمام ناول نگاروں کے صف میں سب سے آگے نظر آتے ہیں۔

نسیم حجازی کا پہلا ناول داستانِ مجاہد کے نام سے قیام پاکستان سے قبل شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے ان کے کئی شہرہ آفاق ناول منظر عام پر آئے۔ ان میں انسان اور دیوتا، محمد بن قاسم، یوسف بن تاشقین، آخری چٹان، خاک اور خون، شاہین، آخری معرکہ، معظم علی اور تلوار ٹوٹ گئی، قیصر وکسریٰ اور اندھیری رات کے مسافر وغیرہ شامل ہیں۔ نسیم حجازی کے ناولوں کا موضوع تاریک اسلام ہے۔

نسیم حجازی اس وجہ سے بھی میرے پسندیدہ ناول نگار ہیں کہ ان کے ناولوں کو پڑھ کر دل میں جرأت و شجاعت، صداقت اور حق پرستی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے ناول اور اسلاف سے عقیدت بڑھاتے اور مشرقی و اسلامی اقدار و روایات سے محبت پیدا کرتے ہیں۔ نسیم حجازی کے ناول ملی اور قومی نقطہ نظر سے بہت مفید اور بہتر ہیں۔ افسوس کہ بعض سیاسی وجوہ کی بنیاد پر اردو ناولِ نگاری کی تاریخ میں نسیم حجازی کی خدمات کو ناقابل التفات ٹھہرایا گیا بلکہ انھیں ناولِ نگار ماننے سے ہی انکار کر دیا گیا۔ اشتراکیت سے ہمدردی رکھنے والے اور بعض ترقی پسند نقادوں کو نسیم حجازی کی اسلام دوستی کھٹکتی ہے۔ چند سال پہلے، دور حاضر کے ایک نامی گرامی ادیب اور شاعر سے پوچھا گیا کہ آپ نے نسیم حجازی کا کوئی ناول پڑھا ہے تو انھوں نے فرمایا: میں نے ان کا ایک ناول پڑھنا شروع کیا تھا، مگر وقت ضائع ہوتا دیکھ کر چھوڑ دیا۔ ایسے لوگ جب عصمت چغتائی کے ناولوں اور منٹو کے افسانوں کو ذکر کرتے ہیں تو ان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ اردو کے جن ناولوں کو "عظیم شاہ پارے" قرار دیا جاتا ہے، ان میں بیشتر ناول لچر، لغو اور فضول ہیں۔ یہ نوجوانوں کو مریضانہ جذبات کے سوا اور کچھ نہیں سکھاتے۔

اردو کا یہ مقبول ترین ناول نگار ۲ مارچ ۱۹۹۶ء کو انتقال کر گیا۔ خدا ان کی مغفرت کرے آمین!